نئی تحریریں

جلد اوّل

مرتبہ

حلقۂ اربابِ ذوق
شاخ کراچی

ناشران:- ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور ـ کراچی

قیمت دو روپے

فہرست

محمد رفیق خاور

غالب۔ ایک ذہنی تشخیص

زندگی اور ادب میں ایک لحاظ سے بہت فرق ہے۔ جب ہم زندگی میں کسی شخص سے دوچار ہوتے ہیں تو تھوڑی ہی دیر میں پتہ چل جاتا ہے کہ اس کا مزاج کیسا ہے اور وہ مختلف امور کے بارے میں کیا رائیں رکھتا ہے۔ لیکن ادب میں ایسا نہیں۔ اس میں لکھنے والا آمنے سامنے بات نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کہنا ہو الفاظ کی آڑ سے کر کہتا ہے۔ وہ ہمارے پاس آنے کے باوجود دور رہتا ہے۔ اور ہم اس سے پوچھ گچھ کر کے اس کے خیالات کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ الفاظ کہنے کو تو اس کی ذہنیت اجاگر کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ ان پر پردہ بھی ڈال دیتے ہیں۔ ایسا طلسمی پردہ کہ اٹھائے نہ بنے۔

غالب ان شاعروں میں سے ہے جن کی ذہنیت پر گہرے پردے پڑے ہیں۔ اسی لئے اس کے متعلق طرح طرح کی رائیں قائم کی گئی ہیں جن میں سے اکثر

ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔ مثلاً بعض اسے امید پرست کہتے ہیں بعض یاس پرست۔ بعض صوفی اور بعض رند۔ بعض تفضیلی اور بعض نہایت آزاد خیال۔ بعض کی رائے میں اس کے یہاں ایک واضح پیغام ہے۔ بعض کہتے ہیں نہیں اور بعض یہ کہ اس کے یہاں ایک نہیں کئی کئی پیغام ہیں۔ ایک اسے رشک پسند کہتا ہے اور دوسرا ایک عام انسان جو محبت میں بھی ایک شانِ بے نیازی رکھتا ہے۔ کوئی اسے نہایت مستعد کہتا ہے اور کوئی عمل کے ناقابل یعنی صحیح معنوں میں ایک شاعر۔ کوئی اسے انسانیت، خلق اور محبت کا دیوتا اور کوئی نہایت خودغرض قرار دیتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے انسان اچنبھے میں پڑ جاتا ہے کہ اس کی ذہنیت فی الحقیقت کیا تھی۔

اس کا صحیح جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں صرف ان جھلکیوں پر ہی قناعت نہیں کرنی ہوگی جو غالب کی شاعری سے چھن چھن کر آتی ہیں اور جن کی اچھی طرح جانچ پرکھ کئے بغیر ہم نے طرح طرح کے قیاسات قائم کر لئے ہیں بلکہ پوری پوری دیکھ بھال کر کے ایسے حقائق دریافت کرنے پڑیں گے جن سے ایک مضبوط نظریہ قائم کرنے میں مدد ملے۔

اسکی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم غالب کے بارے میں وہ تمام کوائف بہم پہنچائیں جن سے اس کی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہو۔ خواہ یہ بالواسطہ ہوں یا بلا واسطہ۔ داخلی ہو یا خارجی، بہ الفاظ دیگر ہمیں غالب کی نظم و نثر کی تمام تحریریں سامنے رکھ کر ان سے تمام ضروری نکات اخذ کرنے ہوں گے۔ اور ساتھ ہی بیرونی ذرائع یعنی معاصرین کی تحریروں۔ سوانح حیات اور گرد و پیش کے حالات

سے قرائن و شواہد کی تلاش کرنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کوئی کلیہ اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا جب تک یہ تمام اجزا کو محیط نہ ہو۔ اگر ان میں سے ایک کڑی بھی ناقص، زائد، بے محل اور بناوٹی ہوگی یا ایک اہم کڑی بھی نظر انداز کر دی جائے گی تو زنجیر نہ مکمل ہوگی نہ مضبوط۔

اگر ہمارے پاس کوئی اور شہادت نہ ہو تو بھی ہم غالب کے الفاظ اسکی تمثیلوں اور استعاروں وغیرہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسے حسن سے کسقدر رغبت تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے ہمیں بہت کم توقع ہوتی ہے کہ اسے مذہب کے ساتھ بھی کچھ لگاؤ ہوگا۔ کیونکہ مجاز اور حقیقت۔ جمال اور جلال ایک دوسرے سے بہت دور ہیں اور جو ایک سے مانوس ہو وہ قدرتی طور پر دوسرے سے مانوس نہیں ہوگا۔ غالباً مذہب آخری موضوع ہوگا جس پر غالب اپنی زندگی میں بات چیت کرتا ہوگا۔ پھر بھی اس نے اپنے بعض مذہبی عقائد کا کئی جگہ بالتصریح ذکر کیا ہے۔ جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اپنے معاصرین کی طرح وہ بھی اسلام کی حقانیت کا قائل تھا اور اسکے معاصروں جو عقائد یا شعائر لازم ہیں ان کا بھی قائل تھا۔ چنانچہ اس نے توحید۔ رسالت اور شریعت وغیرہ کا اسی انداز میں۔ اسی عقیدت سے ذکر کیا ہے جس کی ہم ہر مسلمان سے توقع رکھتے ہیں۔ دراصل جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کی افتاد ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کا دارومدار مذہب پر تھا۔ اور جو بھی کوئی شخص پیدا ہوتا یہ خود بخود اس کے دل و دماغ میں سرایت کر جاتا۔ غالب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا لیکن جو اثر اس نے قبول کیا وہ محض اعتقاد کی حد تک تھا۔ یعنی وہ یہ تو مانتا تھا کہ شریعت کی پابندی لازم ہے لیکن

وہ عملی طور پر کبھی اس کا پابند نہیں ہو۔ شاید وہ دوسرے تو بہت زیادہ لوگوں کی طرح صرف اعتقاد ہی کو کافی سمجھتا تھا۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس کی روشن خیالی۔ شاعرانہ ذوق اور نفاست پسندی رسم و رہ عام اختیار کرنے میں سدِّ راہ تھی اور اس نے ایک ذہنی الجھاؤ کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے وہ صوم و صلوٰۃ سے ہچکچاتا بلکہ گھبراتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض کسل ہو لیکن انسان کے ظاہری طور طریق بھی تو بالعموم کسی داخلی افتادِ طبع کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسلئے ہمیں مجبوراً نفسی توجیہوں پر زیادہ زور دینا ہوگا۔ کچھ عجب نہیں کہ غالبؔ کی فطری بلند نظری اسے عامیانہ کٹّرپن کی اجازت نہ دیتی ہو۔ جیسا کہ اس کے کئی اشعار سے ظاہر ہے۔ مثلاً

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ایسے شاعر کو مذہب پرست کہنا تکلف سے خالی نہیں۔ پھر بھی جس زور شور سے اس نے حمد۔ نعت اور منقبت وغیرہ میں شعر کہے ہیں اور ختم نبوت کے موضوع پر مناظرانہ بحث کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برائے نام مذہب کا قائل نہ تھا۔ اپنے سارے خاندان کے برعکس شیعہ مذہب سے لگاؤ اور وہ بھی اس حد تک کہ — یا علی گفتم و اں ہم ایکے از اسماستے۔ اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ اس سلسلہ میں کلیاتِ فارسی کے

وہ اشعار جو اہلبیت - ترذیج اور امام باڑوں وغیرہ کے متعلق کہے گئے ہیں۔ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ کہاں وہ شخص جس پر دہری ہونے کا گمان تھا۔ اور اس کے لئے ان کا انداز فکر اور لب و لہجہ ہی کافی شہادت ہے۔ اور کہاں یہ مذہب کی اس قدر محدود صورت! ممکن ہے کہ جس طرح غالبؔ عام مسلمانوں کی طرح مسلمان نہ تھا اسی طرح وہ عام شیعوں کی طرح شیعہ نہ ہو چنانچہ اس کے شاگرد حالیؔ نے جو اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ کہا ہے کہ اس کی شیعیت محض اہلِ بیت خصوصاً حضرت علیؓ کے ساتھ عقیدت تک محدود تھی۔ مگر یہ عقیدت پیدا کیوں ہوئی۔ وہ کونسی باطنی تحریک تھی جس نے اسے اس کی طرف مائل کیا۔ اس کے لئے ہمیں غالبؔ کی افتاد مزاج میں کوئی وجہ نہیں ملتی۔ صرف اس کی عجم پرستی ایک ایسی چیز ہے جو اس کی محرک قرار دی جا سکتی ہے۔ اور جب تک کوئی بہتر سبب ہاتھ نہ آئے۔ ہم اسی پر قناعت کرنے پر مجبور ہیں۔

شیعیت کے ساتھ ساتھ غالبؔ تصوّف کا بھی قائل ہے حالانکہ شیعہ حضرات اس کے سخت مخالف ہیں اور پھر وہ برائے نام صوفی نہیں۔ اسے واقعی تصوّف سے گہرا لگاؤ ہے۔ یہ اس زمانے کی ایک عام روش تھی۔ اور جس طرح دوسرے لوگ اس میں بہتے تھے اسی طرح غالبؔ بھی بہا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ میلان شدید یا خود رو نہ تھا۔ ان حالات میں انفرادی میلانات عموماً عمومی میلانات ہی کا عکس بن جاتے ہیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب کچھ خارجی دباؤ کے ماتحت ہوا۔ یہ تو ایک بیساختہ عمل ہے۔ اور جب ابتدائی

مرحلہ طے ہو چکتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرد کے میلانات ذاتی ہیں۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح دریا سے کٹ کر نہر کا بہاؤ اس کا اپنا بہاؤ بن جاتا ہے۔ جب غالب نے تصوف اختیار کیا تو اسے بالکل اپنا بنا لیا اور اس کے فلسفہ کو اپنا فلسفہ تصور کیا۔ اس میں اور تصوف برائے شعر گفتن خوب است میں بہت فرق ہے۔ محض کلام میں آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے تصوف کے مسائل قلمبند کرنے سے وہ والہیت پیدا نہیں ہوتی جو حقیقی ذوق و شوق کا لوازمہ ہے۔

غالب فی الحقیقت تصوف کا قائل ہے۔ وہ اس کے مضامین کے ساتھ دل لگی نہیں کرتا۔ اس نے محض اس کے متفرق مسئلے ہی نہیں چنے جن سے ایک علمی دلچسپی ظاہر ہو بلکہ اس کا تمام فلسفہ جزو ایمان بنا لیا ہے۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک، چنانچہ جب وہ اس کے خاص خاص مضامین قلمبند کرتا ہے تو ہم اس کے کلام میں وہی والہیت محسوس کرتے ہیں جو عطار۔ رومی۔ اور سنائی سے مخصوص ہے۔ اگرچہ اس کا رنگ حکیمانہ زیادہ اور مجذوبانہ کم ہے۔ اور اُن کا سراسر مجذوبانہ، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ غالب نے یہ مسلک عملی طور پر بھی اختیار کیا یا نہیں۔ اغلباً یہ تمام تر چراغان دل پروانہ تھا لیکن جہاں تک وجدانی عمل کا تعلق ہے اس کے حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مزید امتیاز کے لئے یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب مراقبہ نشین یا فنا پرست نہ تھا یہاں اس کی فطرت کے دیگر پہلو تصوف پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن جہاں تک اعتقاد کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فنا کا

خیال اس کے تصور کا لازمی جزو تھا۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ غالب مشاہدات کا شاعر ہے یعنی اس کا زندگی یا قدرت کے متعلق کوئی خاص نکتۂ نگاہ نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے اور غالب کے خطوط اور فارسی و اردو کلام میں اس کی پوری پوری شہادت موجود ہے کہ وہ تصوف کا قائل تھا۔ تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا حیات و کائنات کے متعلق ایک واضح تصور ضرور تھا۔ چونکہ ہمارے یہاں تصوف ایک عام چیز ہو چکی ہے اور اس میں فلسفہ کا عنصر بادی النظر میں زیادہ نمایاں نہیں معلوم ہوتا۔ اسلئے ہم اس کا فلسفیانہ پہلو فراموش کر جاتے ہیں۔ اگر اس کے بنیادی تصور پر نظر ڈالی جائے تو یہ اسی قدر واضح ہے جس قدر اقبال کا فلسفۂ خودی اور جو شخص اسے پیش کرتا ہے وہ لازماً ایک پیغام بھی پیش کرتا ہے۔

تصوف محض ایک خیالی چیز نہیں یہ زندگی اور کائنات کی ماہیت کو سمجھنے اور اس کے مطابق بہترین لائحۂ عمل اختیار کرنے کی کوشش ہے۔ عالم مادی پر نظر کرتے ہوئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ پائدار یا قائم بالذات نہیں۔ اس میں جو کچھ ہے فنا پذیر ہے۔ اسلئے یہ حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اسے بنیادی اصلیت قرار دیا جا سکتا ہے یہ اصلیت اس سے ماورا ہے یہی قائم بالذات غیر متغیر اور مطلق ہے۔ موجودات خارجی محض اس کے چھوٹے بڑے مظاہر ہیں۔ ان کے باہمی تعلق کی مثال دریا اور اس کی سطح پر ابھرنے والی عارضی چیزیں مثلاً موجیں۔ لہریں اور حباب ہیں۔ دریا کا وجود حقیقی ہے اور ان کا غیر حقیقی.... بہتر یہی ہے کہ یہ دوبارہ دریا میں جذب ہو جائیں۔ انسان بھی موجودات

عالم میں شامل ہے۔ اسلئے اس کا وجود بھی غیر حقیقی ہے۔ اور اسے چاہئے کہ اپنے آپ کو وجود حقیقی میں مدغم کردے۔ یہ وجود حقیقی کیا ہے؟ اہل ظاہر سے پوچھا جائے تو وہ مادہ ہی کو ازلی و ابدی قرار دیں گے۔ صوفیا ذات باری کو واجب الوجود مانتے ہیں۔ سائنسداں مادۂ خلقی (PROTO PLASM) کو زندگی اور ایتھر کو کائنات کا بنیادی جوہر مانتے ہیں۔ برگساں کی رائے میں یہ ایک پُراسرار غیر شعوری قوت "زندگی" ہے۔ اقبال کا بھی یہی عقیدہ ہے لیکن وہ زندگی کو دیکھتی بوجھتی قوت خیال کرتے ہیں جو "خودی" یعنی مختلف افراد کا روپ دھارتی ہے اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان تمام مشربوں میں کس قدر مماثلت ہے۔ اور جب ایک شخصی ذات باری کو حقیقی اور انسانی وجود کو غیر حقیقی .... سمجھتے ہوئے یہ تلقین کرتا ہے کہ ہم مجاہدہ و ریاضت سے اپنا محدود انا اس کے لامحدود انا سے ملادیں اور زندگی ہی میں بقا حاصل کرلیں تو وہ بالکل ویسی ہی تلقین کرتا ہے جیسی اقبال اور ایسا ہی پیغام بھی دیتا ہے۔ اس لحاظ سے غالب کی حیثیت اقبال سے مختلف نہیں۔ اس کے یہاں بھی ہستی مطلق یعنی عقل عشق اور فنا کی اصطلاحیں اور وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو کسی نظریہ کو فلسفیانہ حیثیت عطا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ نئی نہیں اور اس وجہ سے نظروں میں نہیں جچتیں۔

اتنی حقیقت واضح ہوجانے کے بعد ایک اور مشکل رونما ہوتی ہے یعنی غالب اپنے آپ کو صوفی کہتے کہتے اس سے انکار بھی کردیتا ہے اور صاف صاف الفاظ میں سب سے پہلے تو وہ مزاحیہ پیرایہ میں کہتا ہے کہ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اور پھر سنجیدہ پیرایہ ہیں کہ

تصوّف نزیبد سخن پیشہ را

سخن پیشہ مرد کج اندیشہ را

اور وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جس بھیس میں وہ ہمارے سامنے آیا تھا اسے بدلنے کی اور بھی کوشش کرتا ہے۔

کہ البتہ ایں رند ناپارسا

کج اندیشہ گبر مسلماں نما

لگے ہاتھوں اس نے تصوّف سے زیادہ مرّوج چیز مذہب کو بھی دھتکار دیا ہے ؎

خوشا رندی و جوش زندہ دو مشرب عندلبش

بہ لب خشکی چہ میری در سرا بستان مذہبہا

عوام کے لئے مذہب شاید غیر معمولی اہمیت رکھتا ہو لیکن ایسے شخص کے لئے جو ان خیالات کا نقیب ہو کہ ؎

وفا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے

مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مذہب چنداں وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک مذہب صرف دو ہیں۔ حق پرستی اور سخن پرستی۔ چنانچہ وہ برملا کہتا ہے کہ ؎

اگر بہ بادہ بود میل شاعرم نہ فقیہہ
سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد
شعار دیں نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی است

اس سے ہمیں قدرتی طور پر غالب کے متعلق اپنا نکتۂ نظر بدلنا پڑتا ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے بڑی کاوش سے اس کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ صحیح نہیں۔ اسلئے ہمیں اُن پتے کی باتوں سے جو اد پر کے شعروں میں سجھائی گئی ہیں۔ اس کی طبیعت کا کھوج لگانا چاہئے۔

اتنا ظاہر ہے کہ یہ شعر یونہی نہیں کہے گئے۔ غالب یہ نہیں کر سکتا تھا کہ تصوف کا عمر بھر پرچار کر کے اسے بگلخت ٹھکرا دے۔ اس کا ضرور کوئی نہ کوئی سبب ہوگا۔ بہت بڑا سبب، کیا یہ زہد اور رندی کی پرانی جھڑپ تو نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر شرعی یعنی محدود اور آزاد زندگی کی جھڑپ کیونکہ ہر شاعر حسن سے لگاؤ رکھتا ہے جو وسیع ترین معنوں میں حسن پرستی یعنی ابیقوریت ہے۔ وہ فطرتاً رنگ و بو کا دلدادہ ہے۔ حواس اور تخیل اس کی سرشت میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ انھیں زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ زیادہ کو زیادہ نتائج حاصل کرنے کے لئے برتتا ہے تاکہ اسے ہر وضع اور ہر قسم کے مشاہدے اور تجربے ہاتھ آئیں ؎

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

جب تک شاعر میں یہ حسی ذوق نہ ہو وہ شاعر نہیں ہو سکتا۔ گویا اسکی طبیعت کا دارومدار ہی مجاز پر ہے۔ اور مذہب۔ تصوّف۔ اخلاق۔ زہد تمام کا مقصد دار و گیر یعنی انسانی سرگرمیوں۔ تجربوں اور مشاہدوں کی حدبندی ہے، یہ جذبات و خیالات کو اپنی رو میں بہنے سے روکتے ہیں۔ اس کی آزادی میں خلل پیدا کرتے ہیں اور حواس اور تخیّل کو اپنا رنگین کھیل نہیں کھیلنے دیتے۔ یوں بھی یہ فکر و عمل کا دائرہ مقرّر کر کے حیاتِ انسانی کو پھیلنے سے باز رکھتے ہیں۔ اس لئے شعرا جو عموماً وسیع المشرب ہوتے ہیں اور جن کے سینے میں زندگی کی تڑپ ایک کافرانہ جنم لیتی ہے۔ انھیں ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔

چنانچہ ایرانی شعرا نے مذہب کی رکھائی۔ ظاہر پرستی اور کڑی بندشوں کے خلاف ردِ عمل کرتے ہوئے بادہ و پیمانہ۔ پیرِ مغاں۔ مغبچہ۔ رند۔ بت۔ بتکدہ۔ زنار اور کفر ایسی اصطلاحیں وضع کیں اور شریعت کے مقابلے میں طریقت کو ابھارا۔ زہد و رندی کی یہ چپقلش دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح نمایاں رہی ہے۔ جیسا کہ عبرانیت (HEBRAISM) اور یونانیت (HELLENISM) الہیت (DIVINITY) اور بشریت (HUMANISM) کی اصطلاحوں سے ظاہر ہے۔ جتنی کسی قوم یا فرد میں مجاز سے رغبت ہو گی اور مجاز سے رغبت بڑی حد تک زندگی سے رغبت ہے اتنا ہی وہ مذہب سے گریزاں ہو گا۔ غالب میں یہ رغبت بدرجۂ اتم تھی۔ وہ ہمیں بے اختیار فاؤسٹس کی یاد دلاتا ہے۔ جو سراپا ذوقِ طلب تھا اور سب کچھ دیکھنا۔ چکھنا۔ سننا۔ چھونا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ "مردِ بہار پیشہ" یہ لقب ہے جس سے غالب کے معاصر اسے یاد کرتے تھے

اور وہ خود کہتا ہے کہ ؎

بہار پیشہ جوانے کہ غالبش نامند
کنوں ببیں کہ چساں خوں چکد زہر نفسش

مولوی ذکاء اللہ نے انھیں پر لے درجے کا دنیا دار اور عیش پرست قرار دیا ہے۔ اور خود ان کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رنگ دبو۔ ناؤ نوش۔ سیر و تماشا کا کس قدر دلدادہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور تصوّف اسکے ماحول کی دین تھے اسلئے اس نے انھیں قبول کر لیا اور جس حد تک وہ ان سے اعتنا کر سکتا تھا کی۔ لیکن دل کی بات اور ہے۔ اس کا میلان کسی اور طرف تھا۔ مجاز کی طرف، نیاز فتحپوری نے کسی جگہ اس کا موازنہ بیدل سے کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے اپنے پیشرو کی زبان مادّی مقاصد کے لئے استعمال کی۔ اس میں وہ والہیت نہ تھی جو بیدل میں ہے۔ اسلئے وہ صرف زبان ہی کی بہار ایجادیاں دکھا سکا۔ دل کے جوہر نمایاں نہ کر سکا۔ یہاں نقّاد نے جو تہ کی بات تھی اسے چھوا تو ہے لیکن اس کے آس پاس جو دوسری اہم کڑیاں تھیں انھیں نہیں چھوا۔ یہ درست ہے کہ غالب نے بیدل کی زبان کو اپنا رنگ دے کر اختیار کیا اور اسے عشق و محبّت وغیرہ کی ترجمانی کے لئے برتا۔ شروع شروع میں یہ کوشش کامیاب ثابت نہ ہوئی اور نہ بالعموم کسی شاعر کی ابتدائی کوششیں کامیاب ہوا کرتی ہیں لیکن بعد میں جب یہ زبان منجھ کر صاف ہو گئی تو غالب نے اسے مادّی مطالب کے لئے بھی برتا اور عارفانہ مطالب کے لئے بھی۔ اور وہ ان دونوں میں کامیاب رہا۔ اگر غالب کا عارفانہ رنگ بیدل کے رنگ سے مختلف ہے تو اس کے یہ

معنی نہیں کہ وہ اس کے مقابلے میں ناکام ہے۔ ہمیں غالب کی ملی جلی حکیمانہ و عارفانہ شاعری کو اسکے اپنے انداز سے پرکھنا ہوگا اور اس میں وہ کسی فارسی و اردو شاعر سے پیچھے نہیں۔ باقی رہے مادّی مطالب یعنی عشقیہ، حکیمانہ، نفسیاتی مضامین تو غالب کی شہرت کا ایک بڑا سبب یہی ہیں اور انھیں فارسی و اردو شعرا میں ایک منفرد حیثیت عطا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں جو بات زیادہ اہم ہے غالب کی مجاز پرستی کا ذکر ہے۔ جسے نقاد نے بیکار سمجھ کر رد کر دیا ہے۔ حالانکہ اسی میں اس کی حقیقی ذہنیت کا سراغ ملتا ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ غالب اپنے آپ کو "کج اندیشہ" کہتا ہے پھر وہ اپنے آپ کو "گبر مسلماں نما" کہتا ہے اور زیادہ زور "سخن پیشہ" ہونے پر دیتا ہے۔ جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں شاعر ہونا در اصل مجاز پرست ہونے کے مرادف ہے۔ اور مجاز پرستی زندگی۔ تہذیب۔ تمدّن۔ ترقی سب کچھ ہے اسلئے یہ الفاظ (سخن پیشہ اور گبر مسلماں نما) کہہ کر غالب نے اپنی طبیعت کھول کر رکھ دی ہے۔ اسی میلان کی توضیح کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

شباب و زہد چہ ناقدردانی ہستی است
بلا بہ جان جوانان پارسا ریزد

اس قسم کی مجاز پرستی باعثِ عار نہیں۔ عار کا باعث تو وہ محدود مذہبی اور تہذیب کے غازہ سے آراستہ مصنوعی کھوکھلی اور بے روح زندگی ہے جسکا

خاکہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے اپنی تصنیف (LADY CHATTERLEYS LOUER)

.... میں اڑایا ہے۔ مجازپرستی دراصل عین حیات ہے اور غالب یہ

کہہ کر اسے بہت اونچے درجے پرلے جاتا ہے کہ ؎

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب

چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

فارسی میں دیدن است مخنپ۔ رمیدن است مخنپ کی زمین میں ایک مستقل غزل ہے جو ذوق تماشا اور ذوقِ حیات کو ایک والہانہ خراج ہے۔ یہ ہے حقیقی زندگی۔ وہ روحانی، تجریدی زندگی نہیں جس کا ہم فلسفوں میں پرچار کرتے ہیں اور اس کے لئے اخلاقی اور مذہبی قانون باندھتے ہیں۔ بلکہ یہ سوز طبیعی۔ یہ ذوق نمو ہے جو اپنے اندر نشوونما کے تمام ممکنات کے بیج رکھتا ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ ہم نے روحانیت اور حقیقت پرستی کو ایک بہت ہی اعلیٰ مقام دے کر مجازپرستی کا مرتبہ گرا دیا ہے۔ محض اسلئے کہ وہ مادّی دُنیا اور جسمانیات سے متعلق ہے۔ ہم اسے مطمح نظر قرار دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن جس شخص میں زندگی کی روح ہو وہ اسے آدرشی نصب العین قرار دینے میں متامل نہیں ہوگا۔ انسان ہے کیا؟ آزادی اور تمناؤں کا پتلا ایک حیانِ صد آرزو۔ ایک حیوان اور اس کی ارجمندی اسی میں ہے کہ وہ ایک حیوان ہو۔ ہشاش بشاش زندہ و توانا حیوان۔ غالب کو اپنی مادّی خواہشات کے اظہار میں کوئی باک نہیں۔ چنانچہ اس نے مثنوی رنگ و بو میں اپنی مستانہ آرزوؤں اور ولولہ انگیز تمناؤں کا ایک دلآویز مرقع پیش کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ اسے عمر بھر جن چیزوں کی تمنا رہی وہ شاہدانِ شوخ۔ شراب و کباب۔ اور رقص و سرود ہیں۔

ازیں ہا کہ بوسیدہ مے خواست دل
ہنوزم ہماں حسرتِ آلاست دل

ان کے مقابلے میں وہ حیات کیا جس میں نہ وصال ہو نہ فراق۔

بفردوس روزن بدیوار کو

وہ بار بار اپنی تمناؤں پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اے آنکہ وہی ما بہ کم و خواہش بیش
آں روز کہ وقت بازپرس آید پیش
بگذار مرا بہ من کہ کارے دارم
با حسرت عیشہائے ناکردۂ خویش

غالب یہ نہیں کہتا کہ اس کی آرزوئیں پوری نہیں ہوئیں بلکہ جس حد تک اس کا ظرف تھا وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اس کی شکایت تمناؤں کے خون

کی شکایت نہیں بلکہ تسکین کی معراج تک نہ پہنچ سکنے کا افسوس ہے۔ وہ تو دل خون ہونے کی فرصت چاہتا تھا۔ یعنی زندگی کی تمام اہلیتوں کے پوری طرح صرف ہونے کی فرصت۔ وہ چاہتا تھا کہ حیات واقعی حیات ہو خصوصاً:

اور اگر اس میں لاابالیانہ پن بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ اگر انسان کچھ دیر بائرن بھی بن جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ وہ رسوائے دہر ہو گا تو کیا۔ اسے اس کا بدل بھی تو مل جائے گا۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم

بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

غالب نے اپنے اس مشرب کو نام بھی عطا کئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو عجمی کہتا ہے۔ اس کی دنیا "آتش لہراسپ" اور "بادۂ مغانہ" کی دنیا ہے اور اس کا مشرب ایک والہانہ "زمیں پرستی" جو مغاں شیوہ ہونے سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے

ہر ذرہ را فلک بہ زمیں بوس مے رسد

گر خاک راست دعوئے ناموس مے رسد

اس آزادانہ زندگی کا جواز اسکے نتائج ہیں۔

اہلِ معنی کو ہے طوفانِ حوادث مکتب

لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

یہ اسے دنیا کے متعلق کچھ سکھائیں گے تو سہی۔ ابنائے جنس کو سمجھنے میں تو مدد دیں گے اسے ایک گھٹی ہوئی دنیا سے باہر نکال کر ایک وسیع فضا میں تو لے جائیں گے۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

غالب ایک غزل گو شاعر ہے اور غزل پریشاں گوئی کی تصویر شاعر کے ذہن میں جس وقت جو آیا کہہ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ شاعر ایک کل نہیں جس سے کبھی کوئی پرزہ ڈھل کر نکلتا ہے۔ کبھی کوئی۔ بلکہ کل بھی تو خاص وضع ہی کے پرزے ڈھالتی ہے۔ اور نہ اس کے مشاہدات تنہا کڑیاں ہوتی ہیں جن کا آپس میں کوئی ربط نہ ہو۔ دوسرے انسانوں کی طرح اس کی طبیعت کی بھی ایک نہج ہوتی ہے جیسے دریا میں دھارے یا راگ راگنیوں میں ٹھاٹھ کی۔ کیونکہ دریا میں کتنی ہی چھپتی ابھرتی موجیں اور لہریں کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ مل جل کر ایک خاص بہاؤ پیدا کرتی ہیں۔ اسی طرح راگ راگنیوں میں غالب سُر اور سروں کی ترتیب سے ایک امتیازی ہیئت تیار ہوتی ہے۔ شاعر تو درکنار سائنسدانوں کے مشاہدات میں بھی ایک انفرادی خاصیت اور ربط پایا جاتا ہے۔ شاعری میں اس ربط کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ رودکی سے لے کر ملک الشعرا بہار اور ولی سے لے کر حسرت و جگر تک کوئی غزل گو شاعر ایسا نہیں جسکی غزلیات ہی سے اس کی شخصیت ظاہر نہ ہو۔ غالب بھی انہی میں سے ایک ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کے کلام سے اس کی طبیعت کا سراغ نہ لگا سکیں۔ غالب کے اشعار میں جابجا ہم وضعی دکھائی دیتی ہے اور ہم اسکی بنا پر اس کی فطرت کا زائچہ مرتب کر سکتے ہیں۔ ایسا زائچہ جو قرین قیاس ہو۔

یقینی نہیں کیونکہ نہ یہ تنقید میں ممکن ہے اور نہ ہم اسے اپنا مطمح نظر قرار دے سکتے ہیں۔

غالب کے کلام میں افکار و مشاہدات کی کئی کئی طرحیں دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ اوپر جس قسم کے مجازی اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ وہ صریحاً ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور خواہ وہ کتنے ہی وقفوں کے بعد کسی زمانے میں لکھے گئے ہوں۔ در اصل ایک ہی ذہنی عالم بلکہ افتاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر شباب کی سرمستیوں کا شعر آخری زمانے میں موزوں ہو جائے تو اس سے شاعر کے نفسی عالم یا افتاد میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوگا۔ شاعر کا دل ایک متفرق چیزوں سے بھرا ہوا صندوق تو ہے نہیں کہ اس میں ہر چیز قرینے سے پڑی ہو۔ ہر انسان آخری وقت تک گوناگوں میلانات کا مجموعہ رہتا ہے۔ اور بعض باتیں جو آخری دور سے مناسبت رکھتی ہوں ان کی جھلک پہلے بھی ظاہر ہو سکتی ہے لیکن یہ محض جھلک یا نیم رس پیداوار ہی ہوگی۔ اور جو ابتدائی زمانے سے متعلق ہوں وہ بعد میں بھی نمایاں ہو سکتی ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر اس زمانے ہی میں ظاہر ہوں گی۔ جو ان کے لئے قدرتی طور پر موزوں ہو۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ غالب کے متعلق ہمیں جس قدر کوائف دستیاب ہوئے ہیں وہ عام تجربے کے پیش نظر کس کس زمانہ سے متعلق ہو سکتے ہیں اور ان کی مناسب ترتیب کیا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ آخری عمر میں انتہائی تلخ کامیوں کا شکار ہونے کے بعد کوئی شخص اس قدر گرم جوش یا لاابالی نہیں ہوگا جتنا وہ شروع میں تھا۔ اور نہ وہ ابتدا ہی میں اس قدر یاس پرست۔ ہو سکتا ہے کہ پر تیاہ کی طرح

اس کے ہونٹوں سے نوحے ہی نوحے بلند ہوں۔ اس سلسلہ میں صحیح روش یہ ہے کہ ہم عام سمجھ بوجھ سے کام لیں اور جس حد تک ہو سکے محققانہ اصولوں کی بنا پر مشاہدات میں ربط پیدا کر کے شاعر کی داخلی ہیئت اجاگر کریں۔

ظاہر ہے کہ جن اشعار میں خوشی و خرمی کی روح بسی ہوئی ہوگی وہ اغلباً اسی زمانہ میں لکھے گئے ہوں گے جب حیات ہنوز اپنی جواں سال امنگوں کے نشے میں جھوم رہی ہوگی۔ اس زمانہ میں "لال پری" واقعی لال پری معلوم ہوتی ہے اور فطرت کا ہر ذرہ حسن و کیف کی سرمست لہروں میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اور دل کی ہر دھڑکن یہ پیغام دیتی ہے کہ محبت کی لاابالیانہ گرمجوشیوں سے کائنات فطرت کو درہم برہم کر دو۔ غالب نے عشق و محبت کے جو گیت گائے ہیں بالخصوص

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس رومانوی رت کی بیساختہ چہکار نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے۔

غرض جہاں تک ہم غالب کے کلام اور دوسرے ذرائع سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کی زندگی رنگینیوں اور ارمانوں سے شروع ہوئی لیکن عام شاعروں سے زیادہ تیزی اور شدت کے ساتھ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غم کا کانٹا

اس کے دامن دل تک چھوا تک نہ تھا۔ فراغت کا زمانہ تھا اور فطرت اور زندگی کی رعنائیوں کا جنوں انگیز تماشا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں غالباً یہ نظم موزوں ہوئی کیونکہ اس میں موج شراب کی صرف ظاہری جلوہ آرائیوں کا ذکر ہے۔ اور اس کا واحد مصرف کسب نشاط ہے

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب ۔ دے بط مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

عمر کی کئی بہاریں اسی طرح سیر و تماشا میں گذارنے کے بعد یا ان کے دوران میں ہی شاعر آہستہ آہستہ زندگی کی کاوشوں اور تلخیوں سے بھی روشناس ہونا شروع ہوا ہوگا۔ مثلاً ابتدائی کلام پر نکتہ چینی اور تضحیک۔ اپنے سے پہلے ہی شادی کے دام میں گرفتاری۔ تنگیٔ معاش۔ دوستوں کی بے مہری۔ بے وفائی۔ حصول مقاصد میں ناکامی۔ بیماریاں۔ عزیزوں کی موت وغیرہ وغیرہ شروع شروع میں تو بالکل یہی کیفیت ہوگی جیسے ہوا کا کوئی جھونکا آیا اور گذر گیا۔ کسی غم نے دامنِ دل کو چھوا اور اس میں اضطراب یا درد کی لہر پیدا کر کے رخصت ہو گیا۔ کوئی بڑا غم بھی آیا تو سطح ہی پر لوٹتا رہا۔ دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ ذیل کے شعر میں شاید اسی طرف اشارہ ہے ؎

لیتا ہوں مکتبِ دلِ غم میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

رفتہ رفتہ غموں کی بوچھاڑ بڑھتی جاتی ہے اور شاعر ایک مرغِ نو گرفتار کی طرح اس کی نشتر زنی سے گھبرا گھبرا اٹھتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی زندگی غم ہی غم اور عذاب ہی عذاب بن جاتی ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں
غم سے جب ہو چکی ہو زیست حرام

زاں نمے ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من

با صلیبم فتادہ کار بدہر
علم کا دیاں نمے خواہم

ایک طرف سینہ میں آرزوئیں ہی آرزوئیں اور دوسری طرف غموں اور مایوسیوں کا ہجوم۔ شاعر ان سے ایک عجیب تشنج کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود اور آخر کار ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ زہر غم اس کے رگ و پے میں فرد ہوتا جاتا ہے اور نوبت یاس یعنی رنج و غم کی انتہا تک پہنچتی ہے۔ اور اس کا مداوا؟ — انسان کے وہ پُرانے دل بہلاوے۔ مے و نغمہ چنانچہ شاعر انہی کے دامن میں پناہ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یاس جب زیادہ دیر رہے تو وہ محض غم ہی نہیں رہتی بلکہ قنوطیت بن جاتی ہے۔ یعنی ایک ایسی ذہنیت جو ہر بات کا تاریک پہلو دیکھتی ہے۔ عارضی

مایوسی جس سے ہر انسان کسی نہ کسی وقت دوچار ہوتا ہے قنوطیت نہیں قرار دی جا سکتی۔ یہ وہ کامل تاریکی ہے جب رات میں ایک تارہ بھی باقی نہ رہے اور ہمیں روشنی پر بھی ظلمت کا گمان ہو۔ قنوطیت میں انسان اپنے آپ اور تمام موجودات کو مجبور تصور کرتا ہے اور اسے ہر کہیں فساد ہی کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اسیر حلقۂ دام بلا ہے۔ کائنات کا کوئی پہلو اچھا نہیں اس میں بیماری ہی بیماری۔ عذاب ہی عذاب اور فنا ہی فنا ہے۔ اور جو چیزیں بظاہر آزاد۔ تندرست۔ خوش آیند اور خوش و خرم ہیں۔ درحقیقت ایسی نہیں۔ انسان فطرتاً برا ہے اور کوئی کفارہ اسکی کثافت کا داغ دور نہیں کر سکتا۔ دنیا میں نفرت ہی نفرت کا چلن ہے۔ محبّت کی گرم بازاری نہیں۔ کائنات پر ایک رحیم و شفیق ہستی کی بجائے ایک طاغوت حکمراں ہے۔ یہ تصویر ایک گزراں لمحے کی اتفاقی پیداوار نہیں جو لہر کی طرح ابھرے اور فرو ہو جائے بلکہ ایک جواں بال موج کی طرح ہے جو تمام دریا کی روانی کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔

جب یہ قنوطیت ایک بار غالب کی طبیعت پر چھا گئی تو اس کا ہر چیز کے متعلق نکتۂ نظر بدل گیا۔ سب سے پہلا ہدف اسکے ابنائے جنس ہی تھے۔ چنانچہ وہ ان کی تعریف کن الفاظ میں کرتا ہے ؎

جس طرح سگ گزیدہ ڈرے آب سے اسد
بھاگوں ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مردم بہ کینہ تشنۂ خون ہمند و بس
خون مے کشیم و چون ہم ازیں مردیم ما

ایسے ظالموں سے مہر و وفا کی امید؟ ـــــــ

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

انسانوں کے ساتھ ساتھ قدرت کے متعلق بھی وسوسے پیدا ہوئے ـــہ

غرقہ بہ موجہ تاب خورد و تشنہ نہ دجلہ آب خورد
زحمت ہیچیک نداد ۔ راحت ہیچیک نخواست

صرف بے اعتنا تو کیا وہ صریحاً سنگدل اور خونخوار ہے ـــہ

آسائشِ زمانہ ز بیداد کردہ اند
ہر خوں کہ ریخت غازۂ روئے زمیں شناس

اشک چشم دام ہے ہر دانۂ صیادیاں
ہے ترحم آفریں آرائشِ بیدادیاں
ہے گداز موم اندازِ چکیدن ہائے خوں
نیش زنبور عسل ہے نشتر فصاداں
قطرہ ہائے خونِ بسمل زیب داماں ہیں اسد
ہے تماشا کردنی گلچینیٔ جلادیاں

یہی خیال ہے جس کا سب سے برجستہ اظہار اردو دیوان کے پہلے ہی شعر میں
کیا گیا ہے یعنی ـــہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہاں شوخیٔ تحریر سے مراد اس کا الٹ یعنی زشتی تحریر ہے۔ اور شاعر کا مدعا یہ ہے کہ کائنات کی تعمیر ہی میں ایک خرابی کی صورت مضمر ہے" ہستی ہر رنگ میں موجب کلفت و آزار ہے" غالبؔ زندگی کو ایک قید خیال کرتا ہے ؎

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی

ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

قید ہستی سے رہائی معلوم

اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

پیچتیہائے قید زندگی معلوم آزادی

شرر در بند دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے

جب یہ بات ہے تو خدا۔ اس تمام کارخانہ قدرت کا بانی مبانی۔ الزام سے کیسے بری قرار دیا جا سکتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

درد ناساز است و درمان نیز ہم

دہر بے پروا و یزداں نیز ہم

یہ احساس آخر بیزاری پیدا کرتا ہے ؎

بہ فیض بے دلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے　　　کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اور بیزاری انسانوں سے وحشت اور خلوت پسندی سے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کچھ عرصہ مے و نغمہ سے غم غلط ہو گیا تو کیا۔ رفتہ رفتہ اس کا اثر بھی کافور ہوتا جاتا ہے سے

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا
مے بود و داسٔے ما بہ پیری غالب
زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

جہاں شراب کارگر نہ ہو وہاں موت تو ہو سکتی ہے سے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
اے قضا در بے مکشا بو کہ در تو بگریزد
ہم ز خویش نو میدے ہم ز خلق بیزارے
آزردگی میں عالم ہستی سے یاس ہے

تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

عمرے بہ تیرگی بسر آوردہ ام کہ مرگ

شادم زروشنائی شمع مزار کرد

لیکن نہیں یہ بھی ہماری بھول ہے۔ کیا خبر موت سے بھی ہستی کے ابدی دکھ کا
علاج ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ انسان ہی نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزیں اسکا شکار ہیں ؎

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے

مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں بھی

سواد خاک میں گاہ یک جہاں سودا

بہ مرگ تکیہ آسائش فنا معلوم

بادیں ہمہ چونکہ انسان پر جینے کی پابندی ہے۔ اسلئے اسے تاب لائے ہی بنتی ہے۔
وہ زندگی کے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کرتا ہے یا دکھ ہی میں سکھ کا روپ دیکھتا ہے
اور اسی کو بجائے خود قابل قدر تصور کرنے لگتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار
خبر دیتے ہیں کہ وہ اس عالم سے بھی گذرا ؎

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

بلکہ غم انسان کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہے ؎

بے غم نہاد مرد گرامی نمے شود

زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ ہم خوشی اور رنج و غم دونوں سے آزاد ہو کر نروان حاصل کرلیں ؎

خوش است آنکہ با خویش جز غم ندارد

وے خوشتر است آنکہ این ہم ندارد

عیش و غم در دل نمے استد خوشا آزادگی

بادہ و خونابہ یکساں است در غربال ما

اب غالب کی زندگی بے چینی اور خلفشار کی طوفانی زندگی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ سکون و قرار کی طرف بڑھتی ہوئی زندگی ہے۔ بڑھاپے کے بڑھتے ہوئے شعور و سنجیدگی اور گوناگوں تجربات نے اسے ایک زیادہ سلجھا ہوا۔ خلیق۔ دردمند اور بالغ نظر انسان بنادیا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنی راہ آپ پیدا کی ہے۔ چنانچہ وہ ایک مثنوی میں فخریہ کہتا ہے کہ وہ نظامی نہیں جس نے حضرت خضر سے فیضان حاصل کیا اور نہ زلالی ہے جس نے خواب میں نظامی سے اخذ فیض کیا بلکہ ؎

من از خویشتن با دل دردمند

نوائے غزل برکشیدہ بلند

یعنی اس نے جو کچھ کہا ہے وہ وجدانی طور پر نہیں جس میں انسان کی اپنی جدوجہد کو کوئی دخل نہیں بلکہ ذاتی تجربے سے حاصل کیا ہے اور اس کی نوعیت مکاشفہ و الہام سے مختلف ہے۔ غالب نے اپنی زندگی ملٹن کی طرح "شعر" بن کر یعنی عارفانہ طور پر نہیں گذاری بلکہ "ضد شعر" بن کر غیر عارفانہ طور پر گذاری اور زیادہ وسیع المشربی۔ جامعیت اور حیاتیاتی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ وہ نبرد حیات

یں کامیاب رہا اور فخر سے کہتا ہے کہ

بہ صبر کم نیم اما عبا را اتو بی

بہ ہر قدر کہ گرفتند کال افتادہ ست

غالب کے آخری اشعار میں جو "سبد چین" میں شائع ہوئے۔ ہمیں خیالات اور بیان میں ایک طرح کا اضمحلال دکھائی دیتا ہے۔ اس کے لہجے میں مذہبیت اور سطحی صوفیانہ فنا پسندی کا رنگ نظر آتا ہے۔ گویا سورج ڈوبتا ڈوبتا دنیا پر ایک دھیمی دھیمی ارغوانی روشنی ڈال رہا ہو۔

از جسم بہ جاں نقاب تا کے این گنج درایں خراب تا کے

من نہ در بند صفاتم تنا نا ہا یا ہو

عاشق جلوۂ ذاتم تنا نا ہا یا ہو

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

غالب بریدہ از ہمہ خواہم کہ زیں سپس

کنجے گزینم و بپرستم خدائے را

اسکے آخری بول اس خواہش سے بالکل ہم آہنگ ہیں

دارم داپسیں برسیدراہ ہے

عزیز داب اللہ ہی اللہ ہے

اگر یہ تجزیہ درست ہے تو ہم غالب کی مقبولیت کا سبب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی آواز ایک فلسفی یا پیغمبر کی آواز نہیں بلکہ ایک شاعر۔ ایک انسان کی آواز ہے۔ ایک ایسا انسان جس نے دنیا کا سرد

گرم دیکھا۔ اس کا ہر رنگ میں مشاہدہ کیا۔ اور وہ باتیں بیان کیں جو ایک
حساس انسان محسوس کر سکتا ہے۔ وہ کوئی گہرا فلسفہ یا حقائق نہیں پیش
کرتا۔ وہ نہ دانائے راز ہے نہ عارف۔ وہ "فلسفۂ حیات" کا نقیب نہیں۔
بلکہ خود زندگی کا ایک جلیل مظہر ہے۔ صرف ایسا ہی شاعر یہ پیغام دے
سکتا ہے کہ ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

اس کی بڑائی یہی ہے کہ وہ انسانوں کا شاعر ہے اور اس کا نغمہ۔ دھرتی کے
دل کا نغمہ۔